اقبال کی شاعری

ماہر القادری

علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں جو کوئی یہ رائے رکھتا ہے کہ علامہ شاعر کم اور فلسفی زیادہ تھے وہ نہ تو فلسفہ سے پوری طرح واقف ہے اور نہ شعر وسخن کا ذوق صحیح رکھتا ہے۔ اقبال جتنے بڑے فلسفی ہیں اتنے ہی بڑے شاعر بھی۔

دنیا میں بڑے بڑے فلسفی گزرے ہیں مگر وہ شاعر نہیں تھے اور کسی فلسفی نے شعر کہے بھی ہوں تو اس کی شاعری قابل ذکر نہیں سمجھی گئی۔ شاعر کے احساسات نرے فلسفی کے مقابلے میں بہت زیادہ نازک ہوتے ہیں اس کے جمالیاتی ذوق کو فلسفی نہیں پہنچ سکتا۔ شاعر کا مشاہدۂ فطرت بھی فلسفی کے مشاہدے سے زیادہ دقیق ہوتا ہے۔ فلسفہ اسباب وعلل کے تانے بانے سے عبارت ہے۔ کتنے ہی فلاسفہ ہیں جو اس تانے بانے میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات جو "حقیقت الحقائق" ہے اور جس کے وجود پر بے چون وچرا ایمان لانا عقل کی معراج ہے اسکے بارے میں ان کا یہ حال ہوا:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

(اکبر الہ آبادی)

فلسفی اور شاعر کے ذوق ومشاہدہ کا فرق اس مثال سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ایک فلسفی باغ میں جاتا ہے اور گلاب کے پھول دیکھ کر اس کے ذہن ودماغ میں

اسباب وعلل کا ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ یہ کہ گلاب کے پھول کا قطر، چنبیلی اور موتیا کے قطر سے اتنا بڑا کیوں ہے؟ گلاب کے پودے میں کانٹے کیوں پیدا کیے گئے ہیں؟ گلاب کے کھلنے اور مسکرانے کی علت غائی کیا ہے؟ باد بہاری گلاب پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟ اور شبنم کا گلاب کی آبیاری اور نشو ونما میں کتنا ہاتھ ہے؟ مگر فلسفی کے برخلاف شاعر باغ میں جاتا ہے اور گلاب کو دیکھتے ہی بے اختیار بول اٹھتا ہے:

اے گل بہ خورسندم تو بوئے کسے داری

"بوئے کسے داری" کہہ کر شاعر نے اپنی نگاہ کے تعمق، وجدان وذوق کی صحت، اور قلبی واردات کی معجزانہ ترجمانی کردی۔ شاعر کی نگاہ اسباب وعلل کے میدان کو ایک جست میں طے کرکے حقیقت تک پہنچ جاتی ہے۔

حسن اتفاق ہے کہ اقبال کی شخصیت شعر وفلسفہ کا سنگم بن گئی ہے، تعقل وتفکر کے ساتھ ذوق جمال کی آمیزش نے اقبال کی شاعری کو بلندی کے ساتھ گہرائی بھی دی۔ شعر وفلسفہ کا یہی حسین امتزاج کلام اقبال کی خصوصیت ہے۔ اقبال ژوف نگاہ بھی ہیں اور خوش نگاہ بھی۔ دنیا میں کسی فلسفی کو شاعری کا وہ بلند منصب نہیں ملا جسے:

"جزو یست از پیغمبری"

کہا گیا ہے۔ اقبال نے فلسفیانہ افکار کو جس سلیقہ اور فن کاری کے ساتھ شاعری کے حسین قالب میں ڈھالا ہے وہ اپنی آپ ہی مثال ہے۔ یہ اقبال کی

خوش ذوقی تھی کہ انہوں نے فلسفہ کی خشکی کو رعنائی اور رنگینی عطا کی! یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ عظیم کارنامہ وہی شخص انجام دے سکتا ہے۔ جو شعر و سخن کی پھول پتیاں بنانے کا فن جانتا ہو! فلسفہ کے مطالبوں اور شعر کے تقاضوں کو ایک دوسرے میں سمودینا یہ ایک طرح کی جادوگری ہے۔

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اور یہ بھی

چہ ساحرانہ کہ آتش ز آب می سازند

پانی کو آگ بنا دینا ستاروں کو توڑ کر ان سے آفتاب تراش لینا اور فلسفہ کے سنگ و آہن میں گداز پیدا کر کے ان سے گل بوٹے بنانا' یہ کرامت علامہ اقبال نے دکھائی ہے۔ وہ محاسن اور صفات جو عظیم شاعری میں پائی جاتی ہیں وہ تمام کی تمام اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ رعنائی فکر' نزاکت تخیل' حسن تشبیہ' ندرت تمثیل' دلکش پیرایہ بیان' اثر انگیز اسلوب اظہار' غرض وہ تمام خوبیاں جن سے "شعر" ترکیب پاتا ہے وہ اقبال کے کلام میں ملتی ہیں۔

زبان پر قدرت:

زبان شعر و ادب کا تانا بانا ہے جب تانا بانا ہی ناقص ہو اور کمزور ہو گا تو اس سے جو چیز بنائی جائے گی وہ بھی کمزور اور ناقص ہو گی۔ ہر عظیم شاعر زبان پر قدرت رکھتا ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسا عظیم شاعر اور ادیب نہں پایا جاتا جس کی زبان کمزور ہو! زبان تو شعر و ادب کی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر شاعری اور ادب کے

محل تعمیر کیے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کو اُردو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ روزمرہ محاورہ اور الفاظ وتراکیب کو صحیح طور پر برتنے کا گر علامہ اقبال جانتے ہیں۔ اب رہیں زبان ومحاورہ کی چند غلطیاں تو اس سے میر اور داغ بھی محفوظ نہیں ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال نے ''پرہیز'' کو مونث باندھا ہے:

اشارہ پاتے ہی زاہد نے توڑ دی پرہیز

بیشک ''پرہیز'' مذکر ہے سیالکوٹ اور اس کے گردونواح میں ''پرہیز'' مونث بولا جاتا ہوگا۔ مگر یہ بھی دیکھیے کہ جہاں استاد فصیح العصر داغ دہلوی نے ''درود'' کو تانیث کے ساتھ نظم کیا ہے:

کیا قبر ناتواں کی ترے بے نمود ہے
افسوس فاتحہ ہے نہ جس کی درود ہے

کہا جاسکتا ہے کہ ''درود'' کی تذکیرو تانیث مختلف فیہ ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ترجیح ''مذکر'' ہے اور اُردو دنیا کی اکثریت درود کو مذکر بولتی ہے۔ میر انیس فرماتے ہیں:

سوتے میں شغل طاعت رب و دود تھا
دل میں خدا کی یاد تھی لب پہ درود تھا

علامہ اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ضلع انبالہ' کرنال اور رھتک کی طرح ضلع سیالکوٹ کا سوانہ بھی مضافات دلی سے نہیں ملتا سنا ہے کہ وہ گھر میں پنجابی زبان بولتے تھے مگر ان کی شاعری اور مضامین میں اتنی صحیح اردو

استعمال کی گئی ہے جو اہل زبان کے امتیازی خصوصیت ہے۔

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

اس شعر میں لفظ ''مداری'' جو ٹھیٹ اُردو ہے اس طرح رکھا گیا ہے کہ جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوتا ہے۔

اچھا ہے کہ بیچارے مولے کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

اٹھا ساقیا! پردہ اس راز سے
لڑا دے مولے کو شہباز سے

اقبال سے پہلے جہاں تک ہمارے محدود مطالعہ کا تعلق ہے۔ ''ممولا'' کسی شاعر کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ بلبل' قمری' طاوس' کبک دری' چکور' یہ نام تو اُردو شعر و ادب میں ملیں گے مگر ''ممولا'' اقبال کی شاعری کے علاوہ اور کسی شاعر کے یہاں شاید نہ ملے۔

اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دل کی دولت لازوال ہے۔ یہ جس کو حاصل ہو جاتی ہے وہ خود اپنی ذات سے ''زندہ جاوید'' بن جاتا ہے مگر اس کے برخلاف تن کی دولت جو دنیا کے عیش و آرام کا نام ہے سایے کی مانند ہے دنیا کے مال و دولت سدا کسی کے ہو کر نہیں رہتے۔ یہ سایے اور یہ پرچھائیں کی طرح آتے جاتے رہتے

ہیں:

طاق حمام است ایں دنیائے دوں
ہر زماں در دست ناپاک دگر

علامہ اقبال نے مندرجہ بالا خیال کتنے سادہ انداز میں پیش کیا ہے۔ پھر جس شاعر کے یہاں ''رعشہ سیماب'' ''قندیل رہبانی'' ''کم اوراقی'' ''شاہین قہستانی'' ''شبستاں وجود'' اور ''حنا بندی'' فارسی اور عربی ملی جلی جیسی ترکیبیں ملتی ہیں اس نے اس شعر میں خالص اردو الفاظ کس سلیقہ کے ساتھ استعمال کیے ہیں! ان میں سادگی کے ساتھ کتنی مٹھاس پائی جاتی ہے۔

''پیری چلنا'' ٹھیٹ اردو محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ادارہ' حکومت' دعویٰ زور چلنا۔ مومن خاں مومن کی غزل کا مطلع ہے:

چلی پیری نہ کچھ بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

دیوان مومن کے قدیم نسخوں میں ''چلی پیری'' ملتا ہے۔ مگر پھر دیوان مومن لکھنو اور دلی کے چھاپہ خانوں میں چھپا تو خود اہل زبان کی سمجھ میں یہ محاورہ نہ آیا اس لیے انہوں نے اپنی بے خبری اور ناواقفیت کا اس طرح اظہار کیا کہ اس ٹکسالی محاورے میں تصرف کر کے اس شعر کو یوں بنا دیا۔

چلی تیزی نہ کچھ باچ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

یعنی ''چلی پیری'' کو ''چلی تیزی'' سے بدل دیا۔ مگر علامہ اقبال کی زباں دانی کو ہزار آفریں کہ انہوں نے اس ٹکسالی محاورے کو اسی طرح استعمال کیا جس طرح وہ زبان میں پایا جاتا ہے فرماتے ہیں:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری

جس محاورے کو اہل زبان بھول گئے وہ اقبال کے ذہن میں محفوظ تھا! یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال اُردو زبان کے محاورے اور روزمرہ پر کامل عبور رکھتے تھے ! اور انہوں نے اردو شعر و ادب کا مطالعہ انتہائی دیدہ ریزی کے ساتھ کیا تھا یہاں تک کہ ان کا شاعرانہ مزاج اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہو گیا۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اردو روزمرہ ''نشہ کرنا'' اور ''نشہ پانی کرنا'' ہے۔ ''نشہ پلانا'' یہ علامہ اقبال کا اجتہاد ہے اور اقبال اس منصب پر فائز تھے کہ وہ زبان میں اجتہاد کر سکتے تھے۔

جس طرح فقہی مسائل میں اجتہاد کے شرائط ہیں اور ہر عالم اور مولوی مجتہد نہیں بن سکتا اسی طرح زبان و ادب میں منصب اجتہاد اسی کو دیا جا سکتا ہے جو

زبان پر پوری طرح قدرت رکھتا ہو۔ زبان کے اصول اور زبان کی نزاکتیں اس پر آئینہ کی طرح روشن ہوں' پوری طرح زبان کا مزاج شناس ہو۔ میں یہ بات خاص طور پر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آج کل ایسے متشاعر اور ناپختہ اہل قلم بھی ہیں جو نہ زبان کا مزاج پہچانتے ہیں اور نہ زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ زبان و روزمرہ میں بیجا تصرف کر کے زبان کو بگاڑ رہے ہین۔ یہ حضرات لکھتے ہیں:

میز کتابوں سے اٹ گئی

حالانکہ ''پٹ گئی'' کا محل تھا۔ ''اٹنا'' تو گردوغبار کے لیے بولا جاتا ہے۔ یوں

''مزدور کا بدن مٹی سے اٹ گیا''

اس قسم کا تصرف ''اجتہاد'' نہیں ہے بلکہ یہ تو وہ تصرف اور نا معتدل دراندازی ہے جو زبان کے حلیہ کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

''اقبال کامل'' کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے علامہ اقبال کی زبان کی اغلاط کا جو باب باندھا ہے اس میں لکھا ہے کہ نشہ پلانا لکھنو میں نہیں بولا جاتا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ''نشہ پلانا'' بے شک لکھنو اور دلی میں نہیں بولا جاتا مگر یہ اقبال کا اجتہاد ہے اور نہایت ہی حسین اور قابل قبول اجتہاد ہے۔ اس اجتہاد سے نہ زبان کا کوئی اصول ٹوٹتا ہے نہ ان لفظوں میں کوئی صوتی یا معنوی نقص پایا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ اجتہاد ان کی زبان سے نکلا اور سننے والوں نے اس کو قبول کرلیا! جس کسی کو اقبال کا یہ اجتہاد بھلا نہیں لگتا اس کا ذوق و وجدان پوری طرح

صحت مند نہیں ہے۔

نواب مرزا داغ دہلوی اور علامہ اقبال کی شاعری کی راہیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور جدا ہیں۔ ان دونوں کی فکر میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ داغ کے یہاں تاک جھانک ہے معاشقوں کی رقابتیں ہیں' وصل و ہم آغوشی کے چٹخارے ہیں' چوڑیوں کی کھنک' پیشانی کی دھنک اور صبح سویرے محبوب کی خوابگاہ سے رخصت ہوتے ہوئے دل کی کسک ہے۔ یہاں تک کہ یہ لے بڑھتے بڑھتے بوس وکنار اور چوما چاٹی تک پہنچ جاتی ہے۔

علامہ اقبال کے یہاں سیاست' فلسفہ' دین و اخلاق اور مدن و تہذیب کے مسائل و افکار ہیں! اقبال کی شاعری فکر و دانش کا بحر اوقیانوس اور فلسفیانہ فکر کا کوہ الوند ہے۔ مگر فکر و نظر اس کے بعد المشرقین کے باوجود اقبال نے مرزا داغ کی شاگردی اختیار کی اور وہ اس لیے کہ داغ کا کلام اردو زبان کی ''انجیل'' اور روزمرہ محاورات کی ''انسائکلو پیڈیا'' ہے۔ یہ دعویٰ کہ:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے (۱)

داغ ہی کے منہ پر پھبتا اور زیب دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے اردو زبان میں بصیرت اور مہارت حاصل کرنے کے لیے داغ کو استاد بنایا اور داغ کی زباں دانی سے پورا فائدہ اٹھایا' اور شاعری میں تلمذ سے تلمیذ کو جو فائدہ ہوتا ہے اس کا حق ادا کر دیا۔ اردو زبان کی یہ امتیازی خصوصیت

بلکہ یوں کہیے کہ کرامت ہے کہ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہوتی وہ بھی مطالعہ اور مشق و ممارست کے ذریعہ اہل زبان جیسے بن جاتے ہیں! اقبال بھی خوش نصیب تھے کہ انہیں داغ جیسا زباں داں استاد میسر آیا اور داغ بھی خوش قسمت تھے کہ انہیں اقبال جیسا شاگرد ملا جس نے شاعری کے نئے زمین و آسمان پیدا کیے اور شعر و سخن کو عظمت و تقدیس عطا کی۔

اقبال کو اپنے استاد داغ سے کتنی محبت اور عقیدت تھی اس کا اظہار مرثیہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے داغ کے سانحہ رحلت پر کہا تھا:

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں

علامہ اقبال جب پہلی بار روم (Rome) گئے ہیں اور وہاں کے تاریخی آثار کو دیکھا تو انہیں بے اختیار دلی کی یاد آئی:

سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت' وہی عظمت' وہی شان دلاویزی

---

(۱) ۲ اکتوبر ۷۲ء کو آرٹ کونسل کراچی میں ماہر القادری نے اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام دانشوروں کے ایک اجتماع میں تقریر کی تھی۔ اس تقریر کو انہوں نے نظر ثانی کے بعد خلاصے کے اضافے کے ساتھ ایک مقالہ کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

(۲) داغ کے دواوین میرے سامنے نہیں ہیں۔ اس طرف بھی خیال جاتا

ہے کہ انہوں نے ''ہندوستان میں'' کی جگہ شاید ''سارے جہاں'' میں کہا ہے! اسی طرح ممکن ہے کہ علامہ اقبال کے اشعار میں کہیں کہیں کوئی دوسرا لفظ راقم الحروف کے ذہن میں محفوظ ہوا اور وہی لفظ کاغذ پر منتقل ہو گیا ہو (م۔ق)

انہیں سیالکوٹ' لاہور' ملتان اور پشاور یاد نہیں آئے دلی کی یاد اس نسبت سے آئی کہ دلی مسلمان بادشاہوں کے جلول وشکوہ کا مظہر رہی ہے۔ وہاں بے شمار اولیاء اللہ اور صاحبان علم وفضل آسودہ ہیں:

دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

(حالی)

دلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ اب بھی مغلوں کی شان وشوکت کے قصیدے سنا رہے ہیں! اردو کے پروان چڑھانے اور گیسوئے اردو کی مشاطگی میں دلی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ قلعہ معلی کو زبان کی ٹکسال سمجھا جاتا تھا یہ شہر ہر فن کے اہل کمال کا مرجع اور مولد ومنشار رہا ہے۔ روضۃ الکبریٰ دیکھ کر دلی یاد آنا اس کی دلیل ہے کہ علامہ اقبال علاقائی اور صوبائی تصورات سے بلند تھے' وہ اس انداز میں سوچتے ہی نہ تھے کہ میں پنجاب میں پیدا ہوا ہوں اس لیے میری تمام توانائیاں پنجاب اور صرف پنجاب کی ترقی کے لیے وقف ہونی چاہئیں۔ اقبال ملت اسلامیہ کے نقطۂ نگاہ سے سوچتے تھے اس لیے کہ ان کا زاویہ نگاہ تنگ نہیں وسیع ولامحدود تھا۔ ان کے سامنے صرف اپنا نشیمن نہیں بلکہ ملت کا چمن تھا۔ کوئی مسلمان کسی بھی خطہ اور صوبہ کا رہنے

والا ہوا اس کا دکھ درد اقبال کا اپنا دکھ درد تھا۔ صوبائی عصبیت وحدت ملی کی قاتل ہے۔ اقبال مسلسل اس کی تلقین کرتے رہے کہ:

وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

وہ ملت کے ساتھ جڑے رہنے کے قائل تھے۔ کس قدر حسین شاعرانہ انداز میں کتنی حکمت کی بات کہی ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

مشرقی پاکستان میں ملت سے کٹنے کی ٹریجڈی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔

آسماں راحق بود گر خوں ببارو بر زمیں

کاش! بنگالی مسلمان ٹیگور کے افکار و خیالات کی جگہ علامہ اقبال کے پیام کو اپناتے تو اپنوں سے کٹ کر غیروں سے رشتہ نہ جوڑتے اور آزادی کی بجائے بھارت کی غلامی قبول نہ کرتے۔ قوم کو اسی قسم کے المیوں اور سانحوں سے بچانے کے لیے اقبال نے مسلمان کو بار بار باہمی اتحاد اخوت اور اسلامی ملت واحدہ سے مربوط رہنے کی تلقین فرمائی۔

شاعرانہ کمال:

اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ علامہ اقبال زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں، الفاظ کو برمحل اور صحیح طریقہ سے برتنے میں وہ بڑے محتاط اور باریک بین واقع

ہوئے ہیں۔ ان کے اشعار جواہرات کی متناسب لڑیاں اور پھولوں کے دیدہ زیب ہار ہیں۔

''کرن'' کی تعریف کس اچھوتے انداز میں کی ہے:

اک شوخ کرن' شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب

اقبال نے اس شعر میں ''کرن'' کو ''شوخ مثال نگہ حور'' کہہ کر کس قدر جمالیاتی حسن پیدا کر دیا ہے۔ مصوعۂ ثانی میں کرن کے اضطراب و حرکت کے لیے ''آرام سے فارغ'' جو کہا ہے اس سے یہ شعر اور زیادہ جاذب ذوق بن گیا ہے۔ شعر میں موزوئی الفاظ کا وہ کمال ہے کہ کسی ایک لفظ کو اس کی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ شعر کے عروج کا یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر کی روح القدس کے ذریعہ مدد کی جاتی ہے۔

ہے رگ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی

نزاکت خیال اور مشاہدے کی باریکی کی حد و نہایت نہیں۔ مجھے اس وقت عرب کے جاہلی شاعر امرؤ القیس کا شعر یاد آ رہا ہے عرب کا یہ ''اشعر الشعراء'' کہتا ہے:

وجل السیول عن الطلول کانها
زبر تجد متونها اقلامها

آزاد ترجمہ: ٹیلوں (کے کگاروں) کو سیل آب نے (اپنی تیزی اور چابکدستی سے) اس قدر خوشنما (اور جاذب نظر) بنا دیا ہے جس طرح قلم تختیوں (الواح) کی عبارتوں کے نوک پلک درست کر دیتے ہیں۔

یہ شعر میں نے اس لیے یہاں نقل کیا ہے کہ عرب کا مشہور شاعر فرزوق اس شعر کو سن کر سجدے میں گر پڑا لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ فرزوق نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ کن شعروں پر سجدہ کیا جاتا ہے۔ تو اقبال کا مندرجہ بالا شعر بھی اسی درجہ کا ہے کہ جو شاعر بھی اس کو سنے گا اسکی گردن جھک جائے گی۔ اور اس عظیم شعر کے حضور وہ تسلیم و کورنش پیش کرے گا۔

جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اقبال کا یہ شعر بھی "لمس تشریح" کو برداشت نہیں کر سکتا:

مانند سحر صحن گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہ پا گوہر شبنم تو نہ ٹوٹے

یہ شعر بھی نزاکت و رعنائی کی ابرک سے بنا ہے۔

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن(۱) کی تلواروں میں تھے

---

(۱) یا "ان کی"

اس سے پہلا شعر ''بزم'' کا شعر ہے۔ اسی مناسبت سے اقبال نے نرم و شیریں الفاظ استعمال کیے ہیں شعر میں کتنی نغمگی پائی جاتی ہے! دوسرے شعر میں گھن گرج ہے اس کے صوتی انداز و لب و لہجہ میں شان جلال جھلکتی ہے! اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان غازیوں اور مجاہدوں کی تلواروں کے جوہر بجلی کی طرح چمکتے تھے اس خیال کو

بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

کہہ کر شعر میں کس قدر (Force) پیدا کر دیا ہے۔

موسم خزاں میں پتیوں کے شاخوں سے گرنے کا ذکر کتنے اچھوتے انداز میں اور کیسی نادر اور فطری تشبیہہ کے ساتھ کیا ہے۔

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دست طفل خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

سوئے ہوئے بچے کے ہاتھ میں وہ حرکت اور وہ گرفت نہیں رہتی جو کھلونوں کو گرنے سے روک سکے! پت جھڑ میں یہی حال پیڑوں اور پودوں کی ڈالیوں کا ہو جاتا ہے کہ پتوں کو اپنے ساتھ جوڑے رہنے کی طاقت ان میں نہیں رہتی!

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے

اس شعر میں اقبال نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب بھی مصرعہ ثانی میں موجود ہے کہ ''نے نواز'' کے دل ہی کی یہ سب کرشمہ سازی ہے چوب تو نوا کے لیے محض

ایک آلہ اور واسطہ ہے‘ اس نالہ کے سرور مستی کا سرچشمہ نے نواز کا دل ہے۔

ملت اسلامیہ کے وہ نامور اسلاف جو فاتح کشور کشا تھے‘ ان کے کردار اور سیرت کی عکاسی صرف ایک مصرعہ میں کی ہے:

ان کی تمنا قلیل‘ ان کے مقاصد جلیل

یہ وہ کنایہ اور رمز و اشاریت ہے جس کی تشریح کے لیے دفتر چاہئیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کا ست نکال کر اس مصرعہ میں بھر دیا ہے۔ دنیا کی تمنائیں جتنی کثیر اور شاخ در شاخ ہوتی ہیں آدمی اتنا ہی بے مقصد ہوتا چلا جاتا ہے یعنی اسکے سامنے زندگی کا کوئی مفید اور عظیم مقصد نہیں رہتا۔ تن پروری‘ تن آسانی اور عیش و راحت اس زندگی کا مقصد بن جاتی ہیں۔ اس لیے دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ دنیا کی حرص و آز اور تمناؤں کی کوئی حد و نہایت نہیں‘ ایک آرزو سے دوسری آرزو جنم لیتی ہے۔ زبان و شکم کی لذتوں اور دوسرے چٹخاروں اور تزئین و آرائش کی تمناؤں کے جال میں آدمی پھنستا چلا جاتا ہے۔ ملت اسلامیہ کے جن مردان کار نے انقلابی کارنامے سرانجام دیے ہیں ان کی تمنائیں بہت محدود تھیں۔ خس پوش مکان جو اسباب زینت و آرائش سے خالی تھے موٹا جھوٹا لباس اور بہت ہی سادہ غذا! ذاتی نام و نمود اور جسم و مکان کی آرائش کا سرے سے کوئی جذبہ ہی ان کے اندر نہ تھا! مگر ان کے مقاصد جلیل تھے اس لیے:

عشق با نان جویں خیبر کشاد

علامہ اقبال نے اپنے شعر میں ایک اصول بیان کر دیا ہے جس کے مقاصد

بلند اور عظیم وجلیل ہوتے ہیں اس کی تمناؤں کا دائرہ بہت ہے تنگ اور محدود ہوتا ہے۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس شعر میں ''شعریت'' کے علاوہ کتنی بھرپور رجائیت پائی جاتی ہے۔ اقبال کے دائرہ فکر و جمال میں ناامیدی بیزاری اور کم حوصلگی کا گزر ہی نہیں ہوتا۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

یہ شعر اقبال کے اس مصرعہ

ان کی تمنا قلیل، ان کے مقاصد جلیل

کی صدائے بازگشت ہے۔ زخارف دنیا سے بے رغبتی کو نئے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں رہبانیت اور ترک دنیا کی کہیں تعلیم نہیں دی۔ دنیا تو برتنے ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے اور مسلمان ہر نماز میں آخرت کے ساتھ ہی اپنی دنیا کے بہتر ہونے (ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ ......) کی دعا بھی اللہ تعالی سے مانگتا ہے۔ رہبانیت آدمی میں بے حوصلگی اور ایک طرح کی قنوطیت پیدا کرتی ہے مگر وہ شاہین جو رہنے کے لیے آشیاں تو نہیں بناتا مگر اس کی پرواز میں مجاہدانہ اسپرٹ پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی قوت بازو سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے اور کسی کا دست نگر بن کر نہیں رہتا۔ شاہین کو اقبال نے ''پرندوں کی دنیا کا درویش'' کہا ہے

یہی ان کی ندرت فکر اور جدت اظہار ہے جو دوسرے عظیم شعرا سے اقبال کو ممتاز کرتی ہے۔

علامہ اقبال اپنے نفس اور ذات کا جو شعور رکھتے ہیں وہ انکسار کے پردے میں نہیں چھپاتے' ان کی ''خودی'' بیساختہ پکار اٹھتی ہے:

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے کہ جس بندے کو چاہے جس نعمت سے نواز دے۔ اللہ کے جود و عطا کا پیمانہ اور اس کا قانون ربوبیت مخلوق کے اندازے سے ماوراء ہے! اللہ تعالیٰ نے کشمیری پنڈتوں کے خانوادے کے ایک فرد کو فکر و دانش اور یقین و ایمان کی اتنی دولت اور طاقت عطا کہ کہ

عالم را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

استعارے:

غالب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کوئی شک نہیں کہ بادہ و ساغر، میخوار و ساقی اور شیشہ و پیانہ کے استعاروں میں شعرا نے بڑے نازک حقیقتیں بیان کی ہیں مگر ان استعاروں کے استعمال کرنے میں شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ حافظ شیرازی کی شاعری ہمارے سامنے ہے ان کے ہاں کیف و مستی کے مضامین اس انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ ان کی زیادہ تر غزلیں رندی و ہوسناکی کی دعوت و تبلیغ بن کر رہ گئی ہیں! ایران کے معاشرے کو حافظ کی شاعری نے بہت متاثر کیا اور عوام و خواص کا میلان عیش و طرب کی جانب ہو گیا۔ طاؤس و بربط اور چنگ و رباب پر حافظ کے اس قسم کے شعر گائے جاتے تھے۔

آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند

اشھی لنا و احلی من قبلۃ العذارا

(کہ تلخ شے کو صوفی "ام الخبائث" کہتا ہے ہمارے نزدیک تو وہ دوشیزاؤں کے (رخساروں) کے بوسے سے بڑھ کر مرغوب اور شیریں ہے)

علامہ اقبال حق و صداقت کے اظہار میں شخصیتوں سے مرعوب نہیں ہوئے انھوں نے اپنے مکاتیب میں بعض مشاہیر صوفیا کے افکار سے پوری جرات کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ اقبال نے اپنے فارسی اشعار میں حافظ شیرازی کے کلام پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کے کلام پر جن کو "لسان الغیب" کہا جاتا ہے اور لوگ جن کے دیوان سے فال نکالتے ہیں علامہ کے یہ اشعار منظر عام پر آ چکے تھے مگر ان کے والد صوفی منش بزرگ تھے اور اپنے ماحول سے متاثر تھے لہذا والد کے اصرار پر

علامہ اقبال نے یہ اشعار اپنے کلام سے خارج کر دیے۔

ہر شخص میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ توفیق کہ وہ استعاروں کی لطافت اور ان کی معنویت کو سمجھ سکے! اس طرف کم ہی نگاہ جاتی ہے کہ ''زلف و گیسو'' سے قدرت کا پس منظر مراد ہے۔ اور شاعر نے ''بادہ'' کہہ کر بادہ الست کی ترجمانی کی ہے یا شیشہ و جام اور مینوشی اور ساقی گری یہ میخانہ معرفت و حقیقت کے استعارے اور اصطلاحیں ہیں! استعاروں کے حجابات اٹھا کر ان کے پس منظر کی حقیقت کا مشاہدہ ہر کسی کا کام نہیں ہے! آدمی کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ ''نفع اجل'' یعنی دیر سے یا مقررہ مدت پر ملنے والے نفع کے مقابلے میں ''نفع عاجل'' یعنی جلدی اور ہاتھ کے ہاتھ ملنے والے نفع کو ترجیح دیتا ہے۔ فارسی ضرب المثل ہے:

نقد را بہ نسیہ گزاشتن کار خرد منداں نیست

یعنی نقد کو ادھار کی امید پر چھوڑ دینا اور آئندہ نفع کی امید پر موجودہ نفع سے دستکش ہو جانا عقلمندوں کا کام نہیں ہے اُردو کی کہاوت بھی ہے:

نو نقد نہ تیرہ ادھار

آدمی کی یہی کمزوری ہے جو عقبیٰ کے لازوال اجر اور جنت کی ابدی نعمتوں سے اس کو غافل کر دیتی ہے اور دنیا کی آنی اور فانی لذتوں میں وہ الجھ کر رہ جاتا ہے۔

مشہور روایت ہے کہ نادر شاہ کی فوجیں دلی کی جانب یلغار کرتی ہوئی بڑھی چلی آ رہی تھیں اور محمد شاہ رنگیلے رقص و سرود اور جام و پیانہ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایرانی فوجیں جب دلی سے تھوڑی دور رہ گئیں تو بادشاہ کی خدمت میں پرچہ

گزر رہا گیا کہ اب تو غنیم سر پر آ پہنچا حضور فوج کو لے کر لشکر کو روکیں۔ محمد شاہ رنگیلے نے بادہ و شاہد اور رقص و سرود کے اس ہجوم میں اس پرچہ کو جو اس کی ذلت و شکست کا پروانہ تھا شاگرد پیشہ کے ہاتھ سے لے کر

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولی

کہتے ہوئے جام شراب میں ڈبو دیا! حافظ شیرازی کے اس مصرع میں اس کے اس طرح استعمال کیے جانے کی بالقوہ صلاحیت موجود تھی۔

علامہ اقبال نے ان استعاروں کی اس نزاکت سے واقف تھے اس لیے انہوں نے ''بادہ و ساغر'' وغیرہ کے استعمال میں کمال احتیاط سے کام لیا ہے فرماتے ہیں:

پلا ساقیا! بادہ پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

''بادہ پردہ سوز'' پڑھ کر قاری کا ذہن وہسکی اور شیمپین کی طرف جا ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ شرابیں تو ''سحر'' ہوتی ہیں یعنی ''پردہ سوز'' ہونے کے بجائے پینے والے کو ہوش و عقل پر اور پردے ڈال دیتی ہیں:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے سبزہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اس شعر میں ''ساقی'' پڑھ کر شراب پینے والے یا شراب پلانے والے کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ اس احتیاط کے باوجود شعر خشک نہیں رنگین ہے اور شاعر کی ہلکی سی

مستی فکر بھی اس میں گھلی ہوئی ہے۔

علامہ اقبال نے استعاروں کی نزاکتوں اور دل آویزیوں سے تو فائدہ اٹھایا ہے اور ان کی "علامیت" کو شعروں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمو دیا ہے مگر ان کے پیرایہ بیان اور اظہار و ابلاغ میں یہ صنعت رکھی ہے کہ استعاروں اور تشبیہوں کی "ظاہریت" شاعر کے "مافی الضمیر" پر غالب ہونے نہیں پائی۔ اقبال کا "ساقی" نہ تو بھٹی کی کشید کی ہوئی شراب پلاتا ہے اور نہ "جام و بادہ" سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ یہ وہسکی اور شیمپین وغیرہ شرابوں کے آلات ہیں:

اٹھا ساقیا! پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

جس ساقی سے علامہ اقبال حجاب راز اٹھانے اور ممولے کو شہباز سے لڑانے کی توقع رکھتے ہیں وہ میکدے اور BAR کا ساقی ہو ہی نہیں سکتا۔ اقبال جس مستی کے طلبگار ہیں وہ ایمان و یقین کی مستی اور خودی کا کیف ہے۔

آزادی اور اقبال کی شاعری:

کسی نظام حکومت' بادشاہی یا آمریت کو بدلنے کے لیے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ عوام کے دلوں میں اس نظام حکومت کے خلاف جذبہ انقلاب پیدا کر دیا جائے اور ارباب اقتدار کے طرز حکومت اور ان کی تہذیب و تمدن کی خرابیاں دلوں میں اتار دی جائیں! علامہ اقبال نے انگریز کے تمدن و تہذیب اور انداز فرمانروائی پر بڑی سخت تنقید کی ہے اور آزادی کی قدر و قیمت کو اجاگر کیا

ہے۔فرماتے ہیں:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

اس شعر میں غلامی سے کتنی نفرت اور آزادی سے کتنی محبت پائی جاتی ہے! غلامی کی زنجیریں اس وقت تک نہیں کٹ سکتیں جب تک غلاموں کے دلوں میں اپنے مستبد آقاؤں کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا نہ ہو جائے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

انگریز کے راج میں ''تہذیب حاضر'' سے ''تہذیب فرنگی'' مراد ہوتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ تہذیب افرنگ اتنا تو ضرور کرتی ہے کہ نگاہوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے مگر یہ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے اور یہ صناعی نگاہوں ک روشنی نہیں دے رہی بس انہیں خیرہ کر رہی ہے انگریزی تہذیب بناوٹی اور مصنوعی تہذیب ہے ان شعبدہ بازوں نے تانبے اور پیتل پر چاندی کا ملمع چڑھا دیا ہے۔

فریاد افرنگ و دلاویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

''چنگیزیِ افرنگ'' یہ شعری ترکیب انگریز کی سیاست اور تہذیب و تمدن پر چوٹ نہیں شاہ ضرب (Master Stroke) ہے۔

اقبال نے انگریزی راج اور اس کے تمدن و تہذیب پر گھن برسائے ہیں اور شاعری کے گرز کی چوٹیں لگائی ہیں! کوئی شک نہیں کہ غیر منقسم ہندوستان کی آزادی میں اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ ہے!

خاص بات قابل غور یہ ہے کہ اقبال نے ہندوستانیوں سے نہیں ''معمار حرم'' یعنی ہندوستان کے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ اقبال جانتے تھے کہ ہندوستان کی غلام اقوام میں انگریز کو سب سے زیادہ کد مسلمانوں سے ہے انگریز ہندوؤں' سکھوں' بدھوں اور جینیوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور ان قوموں کے لیے اس کے رویہ میں نرمی اور جھکاؤ پیدا ہو سکتا ہے مگر ملت اسلامیہ کے لیے تو وہ چنگیز کی طرح سنگ دل ہے۔

ربع صدی ہوئی کہ انگریز اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ہندوستان سے چلا گیا مگر اس کی پالیسی بھارت ے ساتھ ہمدردانہ اور پاکستان کے حق میں مضرت رساں رہی ہے۔ پاکستان اور ملت اسلامیہ کے ساتھ انگریز کی دشمنی اور بدخواہی کا ثبوت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے المیہ میں بی بی سی نے پاکستان کو بدنام کرنے اور اس اسلامی حکومت کا امیج بگاڑنے کے لیے بھارت اور بنگلہ دیش کے حق میں اس شدو مد اور زور و شور کے ساتھ پروپیگنڈا کیا کہ پاکستان کے خلاف جھوٹ کے پہاڑ

کھڑے کردیے!

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں کلمہ حق بلند کرنے کی جس مجاہدانہ اور ساتھ ہی شاعرانہ انداز میں تبلیغ و تلقین کی ہے وہ ان کی شاعری کا بڑا تابناک رخ ہے۔ اور یہ کلمہ حق غلامی اور مظلومیت کے خلاف مجاہدانہ احتجاج ہے:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقبال مسلمانوں میں شان اس الٰہی دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو ظلم اور کفر کے خلاف تختہ دار پر بھی حق گوئی اور بیباکی کا فرض ادا کرتی ہے۔

باطل دوئی پرست ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

حق و باطل کے بین بین رہنے کا موقف منافقوں کو زیب دیتا ہے مرد مومن حق پسند اور خدا پرست ہے اور حق کے ساتھ باطل کی ذرہ برابر آمیزش کو بھی گوارا اور قبول نہیں کرسکتا۔ حق گوئی اور حق پسندی مرد مومن کا شعار ہے اور حق کا باطل کے ساتھ سمجھوتہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کے درمیان کوئی قدر بھی مشترک نہیں ہے۔

عشق کے معنی:

علامہ اقبال کی شاعری کا یک اور کارنامہ بھی ہے جو انتہائی عظیم اور مقدس ہے۔ وہ یہ کہ اقبال نے معروف ''عشق'' کے معنی بدل دیے۔ عام طور پر ''عشق'' کا خیال آتے ہی اس سے عشقبازی اور تماش بینی مراد لی جاتی ہے کسی عورت یا مرد

سے محبت ارو پھر یہ لے بڑھتے بڑھتے گفتگو اور نظارہ بازی سے لے کر جسم کے لمس اور آغوش کی گرمی تک پہنچتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی کتنے ثقہ اور مذہبی شاعر تھے وہ تک یہ کہتے ہیں:

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

مثنوی زہر عشق میں ''عشق'' کی تعریف یوں کی گئی ہے:

مار ڈالا تماش بینوں کو
زہر کھلوا دیا حسینوں کو

مگر اقبال کا عشق زلف و رخسار کے نظارے کے لیے کوٹھوں پر نہیں جاتا وہ تو:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال نے جس ''عشق'' کو پیش کیا ہے وہ انتہائی مقدس اور پاکیزہ عشق ہے جو پیمبرانہ کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ وہ بت پرست نہیں بت شکن اور صنم آشنا نہیں صنم دشمن ہوتا ہے!

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبال جن کو پیر رومی کہتے ہیں انہوں نے بھی عشق کو تقدیس کا رنگ دیا ہے فرماتے ہیں:

عشق اصطرلاب اسرار خد است

مگر جب مولانا رومی غزل کہتے ہیں تو ایسے شعر بھی ان کے دیوان میں پائے

جاتے ہیں:

یک دست زلف ساقی و یک دست جام مے
رقص چنیں میانہ میدانم آرزو است

مگر اقبال کا عشق جو کی روٹی کھا کر قلعہ خیبر کو فتح کرتا ہے۔

عشق با نان جویں خیبر کشاد

اور

صدق خلیل بھی ہے عشق عزم حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبال کے عشق میں مجنوں‘ فرہاد‘ نل‘ رانجھا جیسے عشاق اور دمینتی‘ شیریں‘ لیلیٰ‘ ہیر جیسی معشوق خواتین نہیں ملتیں۔ اقبال کے عشق کے ہیرو حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت امام حسین ہیں جو حق و صداقت اور عزیمت و جرات ایمانی کا معیار سمجھے جاتے ہیں! اقبال کا عشق حسینوں کے کوچوں کی خاک نہیں چھانتا نہ اس میں ہوسناک رقابت پائی جاتی ہے۔ اقبال کا عشق تو بدر و حنین میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کافروں سے نبرد آزمائی کرتا ہے یہاں تک کہ خلافت راشدہ میں عرب و عجم پر اسلام کا پرچم لہرانے لگتا ہے۔

اقبال نے عشق کی شدید جذباتیت کو باقی رکھا مگر اس میں ہوا و ہوس کی جو آمیزش تھی اسے تقدیس و پاکیزگی سے بدل دیا اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری نے ”عشق“ کے معروف معنی ہی بدل دیے!

میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ جن شعرا نے مجاز میں شاعری کی ہے ان کی شاعرانہ عظمت کی نفی کر رہا ہوں۔

جہاں تک زبان کے چٹخارے کا تعلق ہے میں تو میر تقی میر کے اس شعر میں:

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
ادھر آ بے ! ابے ! او چاک گریباں والے

آ بے اور ابے کی بھی قدر کرتا ہوں کہ یہ بازاری لفظ میر نے کس سلیقہ کے ساتھ استعمال کیے ہیں۔ جگر مراد آبادی کا شعر خالص مجاز بلکہ یوں کہیے عشق بازی کا شعر ہے:

صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے
تو یوں ہی دھان پان ہے پیارے

علامہ شبلی عالم دین ہیں سیرت النبی کے مصنف ہیں وہ تو اتنا ہوسناک شعر کہہ گئے ہیں:

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال
بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

ظاہر ہے کہ ''بت شوخ'' سے شاعر کی اہلیہ مراد نہیں ہے خود راقم الحروف نے اس قبیل سے بہت سے عاشقانہ شعر کہے ہیں:

وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشقی پر خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

چلمن کی بندشوں میں وہ شاید نہ رک سکیں
ماہر کے صرف شعر سنانے کی دیر ہے

عاشقانہ شاعری میں جو چٹخارہ پایا جاتا ہے اس سے دل و دماغ کوئی شک نہیں تفریح ونشاط حاصل کرتے ہیں۔اس شاعری نے زبان وادب کو بہت کچھ دیا ہے۔اہل تقویٰ کو بھی تمام احتیاط کے باوجود ہوا وہوس کی جھپٹ لگ جاتی ہے۔ آدمی ہر وقت فرشتہ بن کر نہیں رہ سکتا:

رہ وفا میں ہوس کو بھی رائگاں نہ سمجھ
مجاز اپنی جگہ خود بھی اک حقیقت ہے

شاعران مجاز کی عظمت کے ہم منکر نہیں ہیں خود علامہ اقبال نے سعدی، نظیری، بیدل، اور غالب جیسے غزل گو شعراء سے استفادہ کیا ہے۔نظیری نیشاپوری کے ایک مصرعہ کو وہ اپنی غزل میں لائے ہیں:

بہ ملک جم نہ دہم مصرعۂ نظیری را
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ما نیست

اوراس مصرعہ کو خراج تحسین ان لفظوں میں پیش کیا ہے کہ نظیری کے مصرعہ کو میں جمشید کی سلطنت کے معاوضہ میں بھی نہیں دے سکتا! مرزا داغ خالص غزل کے شاعر ہیں۔علامہ اقبال نے انکی تعریف کس عقیدت کے ساتھ کی ہے:

ہو بہو کھینچے گا حسن و عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پہ تیر کون؟

شاعر ان مجاز حسن و عشق کے مصور بھی تھے اور ناوک فگن بھی ان کی شاعری میں بڑی نشتریت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے شعر و سخن کے ذریعہ کیف و مستی کے خم لنڈھائے ہیں اور شاعری میں جذبات کے آتش کدے بھر دیے ہیں۔ شراب کی تعریف میں یہ شعر انسانی فکر کی حد آخر ہے۔

بہ احتیاط ز دست خضر پیالہ بگیر
مبادا آب حیات دھد بجائے شراب

اور حافظ شیرازی کے دین میں تو محبوب کی ''مژگان سیاہ'' نے ہزاروں رخنے ڈال دیے تھے:

ز مژگان سیہ کر دی ہزاراں رخنہ در دینم
بیا! کز چشم بیمارت ہزاراں درد ہر چینم

یہ شعر تغزل کی معراج ہے۔ اس اعتراف کے باوجود ہوسناک شاعری نے معاشرے کے اخلاق پر اچھا اثر نہیں ڈالا۔ ان شعروں میں سے کوئی شک نہیں دل و دماغ تفریح حاصل کرتے ہیں مگر زندگی صرف ''تفریح'' کا نام ہی تو نہیں ہے! علامہ اقبال نے عوام سے داد لینے اور ان کو تفریحات میں الجھانے کے لیے شاعری نہیں کی۔ ان کی شاعری کا رخ تعمیر و اصلاح کی جانب پھر گیا۔ اقبال نے شاعری کو رفعت فکر کے ساتھ تقدیس و پاکیزگی عطا کی۔ نیکی اور پاکیزگی میں جو حسن ہوتا ہے وہ ہوس کے چٹخاروں سے زیادہ لطف انگیز اور پائیدار ہوتا ہے۔ اقبال انتہائی لطیف جمالیاتی ذوق رکھتے ہیں جسے انہوں نے شاعری میں تفریح

کے لیے نہیں بلکہ تعمیر میں صرف کیا ہے۔

جہاں تک شعروسخن کی خوبیوں کا تعلق ہے اقبال کی اصلاحی تعمیری اور اخلاقی و انقلابی شاعری مجاز کی شاعری سے اس کے بے پناہ چٹخاروں کے باوجود دیتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اقبال نے گل ولالہ ابروبہار شبنم وبرشگال شوخی نگاہ کیف و مستی ساقی وبادہ تشنگی وسیرابی جنون و بےخودی اور وصل وفراق کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں مگر ان کے معانی کو پاکیزہ بنا دیا ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں صرف پاکیزگی ہی نہیں شوخی ورعنائی بھی پائی جاتی ہے۔ ایک مصور کسی حسین عورت کی نیم برہنہ تصویر میں اپنے فن کی مہارت سمو دیتا ہے۔ دوسرا مصور پھولوں کلیوں آبشاروں اور کوہساروں کی تصویروں کو اس قدر جاذب نظر بناتا ہے کہ نیم برہنہ عورت کی تصویر ان کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

چٹخارے کی شاعری بڑی جلد مقبول ہو جاتی ہے بازاروں سیر گاہوں اور پارکوں میں اس قسم کے شعروں کی گونج سنی جاتی ہے:

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

رقاصائیں طوائفیں اور گانے والے زیادہ تر اسی قسم کے اشعار گا کر لوگوں کو

خوش کرتے اور روزی کماتے ہیں۔

علامہ اقبل نے شعروسخن کی روش عام کو چھوڑ کر اصلاح و انقلاب کی روش اختیار کی اور اس طرح۔

زمانہ با تو نسازد تو باز مانہ ستیز

کی تلقین کع عملاً پورا کرکے دکھادیا۔ زمانہ کی رش سے ہٹ کر علامہ اقبال نے اپنی شخصیت اور شہرت کو خطرے میں ڈالا۔ جس انداز میں شرع کہنے سے اقبال چمک سکتے تھے اور مقبول و مشہور ہو سکتے تھے وہ جادہ انہوں نے بلوغ فکر کے بعد ہی ترک کر دیا۔ مگر جب ان کی یہ غزل رسالوں میں چھپی جس کا مطلع ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو اس غزل کو پڑھ کر ارباب ذوق چونک پڑے' انہوں نے محسوس کیا ک تغزل کا یہ آہنگ ہی جدا ہے۔ ''سجدوں کا جبین نیاز میں تڑپنا'' اقبال سے پہلے اردو زبان و ادب میں نہیں ملتا۔ لکھنو کے مشہور مزاحیہ ہفتہ وار ''اودھ پنچ'' میں اس کا مذاق بھی اڑایا گیا کہ جب سجدے پیشانی میں تڑپ سکتے ہیں تو ٹہل بھی سکتے ہیں اور پھدک بھی سکتے ہیں۔ مگر یہ آوازے بہت جلد دب کر اور پانی کے بلبلوں کی طرح ٹوٹ کر رہ گئے۔ بات اقبال ہی کی بلند و بالا رہی!

اقبال کی شاعرانہ خوبیوں کا یہ معجزہ ہے کہ مجاز و ہوس کی رنگین اور چٹخارے دار شاعری کے ہوتے ہوئے اقبال کی پاکیزہ اور تعمیری شاعری کو قبول عام حاصل ہوا'

اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب تک تو بے شعر اپیدا ہوتے رہے ہیں قد آور شاعر تو یہ پہلی بار منظر عام پر آیا ہے!

اگر اقبال یہاں صرف رفعت خیال اور بلندی فکر ہوتی اور شاعرانہ محاسن سے ان کا کلام عاری ہوتا یا شاعرانہ خوبیاں واجبی واجبی ہوتیں تو اقبال کا کلام خواص و عوام میں مقبول نہ ہوتا۔ اقبال کے کلام کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ فکر و خیال کی ندرت کے ساتھ تمام شاعرانہ محاسن ان کے کلام میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے اقبال کا آرٹ بلند ترین آرٹ ہے ان کی شاعرانہ صنائع فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ جو دل و دماغ پر غور و فکر کے نئے دریچے کھولتی ہے ۔ اقبال کی شاعری میں تغزل کا رچاؤ ملتا ہے مگر "تغزل" سے انہوں نے تعمیر و اصلاح کا کام لیا۔

اقبال کی شاعری میں عقل کا مقام:

علامہ اقبال عقل کی ضرورت' صلاحیت اور اس کے وظیفہ عمل (Function) کے منکر نہیں ہیں۔ اور وہ تعقل و تدبر کا انکار کس طرح کر سکتے ہیں جب کہ قرآن کریم میں تعقل و تدبر کی بار بار دعوت دی گئی ہے۔ جب ہاتھوں' پیروں اور آنکھوں سے انسان کام لیتا ہے تو عقل جو عطیہ الٰہی ہے اسے کس طرح نظر انداز کر کے معطل اور بیکار بنا سکتاہ! عقل کا انسانی زندگی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے:

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے

اس اعتراف کے بعد وہ یہ بھی کہتے ہیں:

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

اقبال نے عقل کو ''چراغ راہ'' کہا ہے کہ اس کی روشنی میں انسان سفر کرتا ہے مگر عقل ''منزل مقصود'' نہیں ہے:

گزر جا عقل سے آگے گزر جا
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبال نے یہ نہیں کہا کہ عقل بیکار یا زیادہ سے زیادہ اضافی شے ہے۔ زندگی میں اس کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت ہی نہیں ہے۔ اقبال عقل کی ضرورت اور افادیت کے قائل ہیں مگر عقل کی بات تو قول فیصل نہیں سمجھتے۔ عقل غلطی بھی کرتی ہے۔ عقل مسائل کے حل کرنے میں بے شک مدد دیتی ہے مگر وہ حاکم اعلیٰ نہیں ہے جس کے فیصلے نظر ثانی کے محتاج ہوتے ہیں۔

اقبال عقل پر دل کو بے شک ترجیح دیتے ہیں کیونکہ دنیا میں انقلابی کارنامے عقل نے نہیں دل نے انجام دیے ہیں۔ عقل کی سنجیدگی اپنی جگہ مسلم ہے مگر وہ جری و بیباک نہیں ہوتی۔ عقل سوچتی زیادہ ہے اور عمل کم کرتی ہے۔ عقل زندگی کی راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا سکھاتی ہے۔ مگر دل کی فعالیت انسان کو مجاہد و سرفروش بناتی ہے! قلم معاہدے اور صلحنامے لکھ سکتا ہے مگر رزمگاہ میں قوموں کی تقدیر کا فیصلہ زبان شمشیر کرتی ہے! عقل صرف سوچتی ہے دل سراپا حرکت و عمل ہے

عقل میں سنجیدگی اور ٹھیراؤ ہے اور دل میں طوفان کی قوت رواں دواں ہے۔

علامہ اقبال کی نگاہ حقیقت شناس میں اہل دل ارباب عقل سے بلند مقام رکھتے ہیں! فلسفہ عقل ہی کی موشگافیوں سے عبارت ہے۔ افلاطون کتنا عظیم فلسفی ہے کہ فلسفہ اس کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ افلاطون کی فلسفیانہ شہرت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں! مگر اقبال کی رائے افلاطون کے بارے میں یہ ہے:

تڑپ رہا ہے افلاطون میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

''اعراف'' جنت و جہنم کے درمیان ایک مقام ہے جسے بجا طور پر ''برزخ'' کہا جا سکتا ہے۔ دنیا اور عقبیٰ کا ''برزخ'' نہیں ''جنت و دوزخ کا ''برزخ'' جہاں کبھی دوزخ کے شعلوں کی لپٹ آجاتی ہے اور کبھی جنت الفردوس کی نسیم خنک و معطر کے جھونکے! اعراف میں رہنے والوں کو نہ دوزخی کہا جا سکتا ہے اور نہ جنتی! اس اعتبار سے کہ وہ جہنم کے عذاب سے محفوظ ہیں خوش قسمت ہیں اور اس لحاظ سے کہ وہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں سے محروم ہیں بدنصیب ہیں...... اقبال کی نگاہ میں افلاطون اس اعراف میں ہے جو قرب و دوری اور غیب وحضور اور ایمان وانکار کے بین بین ہے۔

علامہ اقبال نے قدیم و جدید فلسفہ کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔ مشائیت اشراقیت' رواقیت' لذتیت اور پھر یورپ کے فلسفہ کے تمام مکاتیب کا اقبال نے مطالعہ کیا ہے۔ فارابی اور بوعلی سینا ہوں یا ابن رشد اور رازی ہوں اقبال نے ان

کے فلسفیانہ افکار سے متعارف ہیں اوران افکار سے اقبال نے استفادہ کیا ہے:

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

تلقین غزالی کے اقبال مداح ہیں مگر اقبال اس سے بھی آگاہ ہیں کہ بڑے بڑے فلسفیوں نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں۔

قرآن پاک میں کئی مقامات پر آیا ہے:

ولیعلم اللہ الذین آمنوا" (آل عمران)

اور وہ اس لیے کہ اللہ معلوم کر لے کہ اہل ایمان کون ہیں۔

"ولیعلم الذین نافقوا" (آل عمران)

تا کہ (اللہ) منافقوں کو معلوم کر لے

"لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب"

تا کہ اللہ جان لے کہ کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

بعض اکابر مسلمان فسلفیوں کو لیعلم اللہ (اللہ جان لے...... تا کہ اللہ معلوم کر لے) سے دھوکا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہوتا (معاذ اللہ) یعنی کوئی واقعہ جب اپنی جزئیات کے ساتھ ظہور میں آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہوتا ہے یہ فلسفیانہ فکر ضلالت و جہالت کے سوا کیا ہے؟ حالانکہ یہ قرآن کا انداز بیان ہے کہ جو چیز مخلوقات کی نسبت سے وقوع میں آتی ہے اور زمان و مکان کی قدروں اور پیانوں سے اس کا تعلق ہوتا ہے اسے قرآن "لیعلم اللہ" کے پیرایہ میں بیان کرتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہے اور ہر واقعہ اور شے کا اسے کلی علم تمام

جزئیات کے ساتھ ہے۔ یہ مسلمان فلاسفہ کے شطحیات نہیں بلکہ مزلات ہیں۔ اسی لیے اقبال نے کہا ہے:

بو علی اندر غبار ناقہ گم

پیر رومی پردہ محمل گرفت

بو علی سینا محض اپنے تفلسف اور تعقل کے سہارے حقیقت کی جستجو میں چلا تھا تو وہ بیچارہ غبار ناقہ ہی میں گم ہو کر رہ گیا مگر مولانا روم نے جذب یقین ور نور ایمان کے سہارے محمل تک پہنچ کر لیا اے حقیقت کا پردہ تھام لیا۔

پھر ایک اور چیز ہے وہ یہ کہ عقل شریعت کے ہر حکم کی علت، حکمت اور افادیت معلوم کرنا چاہتی ہے۔ کوئی شک نہیں شریعت کا ہر قانون حکمت و افادیت رکھتا ہے مگر کسی مسلمان نے شریعت کے احکام پر ان کی حکمت و افادیت معلوم کرنے کے بعد عمل کیا تو اس نے خدا اور رسول کے حکم کی تعمیل کہاں کی بلکہ اس نے تو حکمت و افادیت کی اطاعت کی! مثلاً لحم خزیر کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے اس کی حرمت نہ تو علت و غایت بتائی گئی اور نہ عقل اس کا پتا لگا سکتی ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ لحم خزیر کی مضرت کا پتہ لگائے بغیر اسے حرام اور قابل نفرت سمجھا جائے۔

جو کوئی اللہ اور رسول پر ایمان نہیں لایا اس کا معاملہ دوسرا ہے مگر اللہ اور رسول پر ایمان لانے کے بعد ہر حکم کی بے چون و چرا اطاعت فرض ہو جاتی ہے۔ بندے کا کام اطاعت و انقیاد (سمعنا و اطعنا) ہے۔

سامنے کی بات یہ ہے جو کوئی شخص کسی دفتر میں ملازم یا کسی ادارے، تنظیم اور

جماعت سے وابستہ ہو جاتا ہے تو اسے محکموں، دفتروں، اداروں اور تنظیموں کے قوانین کی پابندی کرنی ضروری ہے، اس پابندی اور عقل کے مابین کوئی تصادم نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے "عقل" پر سب سے زیادہ سخت تنقید اس مصرعہ میں کی ہے:

عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

اقبال کے نزدیک وہ عقل "تمام بولہب" ہوتی ہے جو انفس و آفاق پر غور کرنے کے بعد بھی خالق و رب کے وجود کا انکار کرتی ہے! اللہ کے انکار کی ابتدا فلسفیانہ تشکیک اور عقلی ارتیاب سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ تشکیک "انکار" تک پہنچ جاتی ہے۔ تو ایسی عقل بولہب نہیں تو اور کیا ہے! اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں سب سے پہلے شیطان نے منطق چھانٹی اور عقل (Reasoning) کو غلط طور پر استعمال کیا۔ عقل عمومی یا یوں کہیے صحت مند عقل کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے!

علامہ اقبال اس تصوف کے موافق ہیں جس کا تعلق تزکیہ نفس اور "احسان" سے ہے مگر عجمی تصوف کے مخالف ہیں۔

سکھا دیے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

خانقاہی اور عجمی تصوف نے تصوف کو "علم کلام" بنا دیا، جس طرح "علم کلام" میں ایسی غیر ضروری اور ژولیدہ بحثیں ملتی ہیں کہ صفت عین ذات ہے یا غیر ذات ہے، دوزخ میں عذاب اور روح پر ہوگا یا جسم پر "وھلم جرا" اسی طرح عجمی تصوف

میں بھی ان حقائق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جن کے لیے انسان مکلّف اور جواب دہ نہیں ہے۔ قیامت میں بندوں سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم وحدت الوجود پر ایمان رکھتے تھے یا وحدت شہود کے قائل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور خاص طور سے ختم نبوت پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اقرار رسالت کے بغیر اللہ پر ایمان لانا بھی معتبر نہیں قرار پایا اور حضور کی اطاعت بھی منصوص ہے مگر ''حقیقت محمدی'' کی جستجو اور اس کی تحقیق اہل ایمان پر لازم نہیں کی گئی' اس قسم کی بحثوں کا نتیجہ عقائد میں التباس پیدا کرتا ہے۔ اور پھر عقیدت کا غلو آدمی کو اس سطح تک پہنچا دیتا ہے کہ ''احمد'' اور ''احد'' کے درمیان بس ایک ''میم'' کا پردہ ہے اور

تو	سلطان	صاحب	سریر	آمدی
علی	کل	شئی	قدیر	آمدی

حالانکہ ''علی کل شئی قدیر'' صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ کسی انسان کو چاہے وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو یہ الوہی مرتبہ اور قدرت حاصل نہیں ہے۔

امام غزالی کتنی عظیم شخصیت کے حامل ہیں مگر ''سماع'' کے بارے میں ان کا قول ہے کہ اہل کے لیے حلال اور نا اہل کے لیے حرام ہے۔ لیکن شریعت اور فقہ کی کوئی اصطلاح ''اہل'' یا ''نا اہل'' نہیں ہے۔ شریعت کی اصطلاحیں نابالغ و بالغ' مستطیع و غیر مستطیع' مکلّف و غیر مکلّف اور عاقل و غیر عاقل ہیں۔ اصل چیز شریعت ہے۔ طریقت کے مسائل کو بھی شریعت کی کسوٹی پر کسا اور پرکھا جاتا ہے۔ طریقت

ہو یا تصوف یہ شریعت کے تابع ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ "وحدت الوجود" شریعت کا نہیں طبعیات کا مسئلہ ہے مثلاً سائنس دان جب یوں کہتے ہیں کہ کائنات میں "انرجی" (Energy) پائی جاتی ہے تو یہ شریعت کا کوئی کلیہ نہیں ہے بلکہ طبعیات کا نظریہ ہے۔

شاعری میں مذہب کا ذکر رجعت پسندی نہیں ہے:

بعض کم نظر علامہ اقبال کے کلام پر ہمدردانہ لہجہ میں یوں گفتگو کرتے ہیں کہ اقبال مذہب کو اپنی شاعری کا موضوع نہ بناتے تو ان کی شاعری اور زیادہ آفاقی ہو جاتی۔ حالانکہ متعدد عظیم شعرا نے اپنی شاعری میں مذہب کو سمویا ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری عظیم سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ سو فی صد غلط ہے کہ مزہب کا ذکر لانے سے شاعری محدود ہو جاتی ہے۔

یونان کے سب سے بڑے شاعر ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی میں مذہبی عقائد کا خاصہ عنصر ملتا ہے اور وہ کثرت کے ساتھ اولمپیا کے خداؤں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے عقائد میں دینیت بھی پائی جاتی ہے۔ ورجل اٹلی کا بہت اونچے درجے کا شاعر ہے۔ اس کی "" اینائڈ" میں مذہبی تصورات ملتے ہیں۔ اس نے اس خیال کو نظم کیا ہے کہ رومتہ الکبریٰ کو عظمت اسو جہ سے نصیب ہوئی کہ خدا اس کے ساتھ ہے۔

ملٹن کی فردوس گم گشتہ (Paradise Lost) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا اقرار کیا گیا ہے۔ اس نظم میں تالمود کی روایات اور عیساء چرچ کی تعلیمات سے بہت کچھ لیا گیا ہے۔ شاعر کی فکر عیسوی مذہب سے متاثر

ہے۔فردوس بازیافتہ (Paradise Regained) میں ملٹن نے بتایا ہے کہ جنت کو آدم نے گم کر دیا تھا مگر عیسیٰ کے ہاتھوں واپس مل گئی۔

ڈانٹے کی ''کامیڈی'' کو مغرب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔مغرب کے نقادوں میں ٹی ایس ایلیٹ کی شخصیت ممتاز ہے اس نے کہا ہے کہ ''کامیڈی'' دراصل (مادی نہیں) مابعد الطبیعیاتی شاعری ہے۔ڈانٹے چرچ اور اسٹیٹ دونوں کو من جانب اللہ ایک ہی مشن کا حامل بتاتا ہے۔مذہب اس کا دل و دماغ پر اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ وہ کہتا ہے کہ منطق سے ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے ایمان کے سامنے قیل وقال اور چون وچرا کی سرے سے گنجائش نہیں ہے۔

جب اتنے مشہور بین الاقوامی شہرت کے حامل شعرا مذہبی افکار کو شاعری میں لانے کے سبب ''عظیم'' سمجھے جاتے ہیں اور مذہبی افکار نے ان کی شاعری کو بٹہ نہیں لگایا اور ان کی شاعرانہ عظمت کو مجروح نہیں کیا تو اقبال کی شاعری میں اسلام کی ترجمانی بعض لوگوں کو آخر کیوں کھٹکتی ہے۔

☆ کسی مذہب کے عقائد پر نقد وتبصرہ اس وقت موضوع بحث نہیں ہے ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین دین صرف اسلام ہے کما قال اللہ تعالیٰ......ان الدین عند اللہ الاسلام۔

اس قسم کے معترض اور ناقد اعصابی بیمار اور ذہنی مریض معلوم ہوتے ہیں۔وہ

شخص نا منصف اور غیر حقیقت پسند ہی نہیں ہے بے ذوق بھی ہے جو شاعری میں مذہبی رنگ دیکھ کر ترش ابرو اور سر کہ جبیں ہو جاتا ہے۔ایک شخص چاہے کتب خانے کھنگال چکا ہو مگر وہ مذہبی افکار پر رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی طنز کرتا ہو اسے دانشور نہیں کہا جا سکتا۔ دانشوروں کو مذہب سے بیر نہیں ہو سکتا۔ مذہب سے بیزاری دراصل حقیقت سے بیزاری ہے۔علامہ اقبال کے نزدیک بے یقینی قلب ونظر کی موت ہے۔ان کے افکار میں ''یقین'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جو لوگ نہ یقین و ایمان کو جانتے ہیں اور نہ توحید کو سمجھتے ہیں اقبال کی نگاہ میں ایسے لوگ اپنے دماغوں میں بت خانے رکھتے ہیں:

سمجھ میں نکتۂ توحید تو آ سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

صرف اسلام کی ترجمانی:

دین میں جبر نہیں ہے۔ (لا اکراہ فی الدین) ہر شخص جس مذہب اور نظریہ کو چاہے قبول کر سکتا ہے۔قرآن کریم میں ہٹ دھرم منکروں اور کٹے کافروں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق وحی ترجمان یوں خطاب کرتا ہے:

لکم دینکم ولی دین

(تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے)

اگر کوئی شخص اسلام کو نہیں مانتا تو اسے اپنے اس فکر و خیال کے اظہار کا حق حاصل ہے۔اسلام لا کر پھر کفر کی جانب لوٹ جانا یہ جرم (ارتداد) تو اسلام میں

قابل مواخذہ ہے اور اس کی بڑی سخت سزا ہے مگر ''کفر'' کی سزا اسلام کے ضابطہ فوجداری میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ ایک مفکر اسلام کو پیش کر رہا ہے مگر جو اہل اسلام پر یقین نہیں رکھتے وہ اس فکر کے اسلامی افکار کی طرح طرح کی تاویلیں فرما کر انہیں ملتبس اور مشتبہ بنانا چاہتے ہیں۔ کھل کر کہیے کہ ہمیں اقبال کے اسلامی افکار سے اتفاق نہیں ہے مگر یہ ظلم تو نہ کیجیے کہ اقبال کا پیغام تو اسلام کا پیغام ہے۔ مگر آپ اس کا کسی دوسرے "ISM" اور نظریہ حیات سے پیوند جوڑ دیتے ہیں۔ یہ علمی بددیانتی ہے۔

اقبال کی شاعری میں مسولینی کا نام آجانے سے اقبال کے افکار کا ''فاشزم'' سے جوڑ ملانا اور لینن کے ذکر کے سبب اقبال کے افکار پر اشتراکیت کا ٹھپہ لگا دینا پرلے درجہ کی ناانصافی ہے۔

جس کھیت کے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

کیا صرف یہ شعر اقبال کی تمام شاعری کا محور قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس شعر میں ایسی توجیح بھی ممکن ہے جس سے اشتراکیت کو سہارا نہیں مل سکتا؟

علامہ اقبال کا مطالعہ بہت تھا۔ وہ فلسفی ہی نہیں شاعر بھی تھے مطالعہ کے دوران میں جب ان کی طبیعت میں آمد پیدا ہوئی ہے تو اس مطالعہ کی جھلک کہیں کہیں ان کے شعروں میں بھی آگئی ہے۔ جو کوئی ان مضمحل جھلکیوں کو دیکھ کر یہ حکم لگاتا ہے کہ اقبال مانویت، زروانیت یا اشتراکیت سے متاثر تھے وہ گندم کے انبار میں سرسوں

کے چند دانے دیکھ کر گندم کے پورے انبار کو سرسوں کا ڈھیر ثابت کرنے کی جاہلانہ کوشش کرتا ہے دانشوروں کو یہ بازی گری اور ہٹ پھیری کسی طرح زیب نہیں دیتی ۔گلاب کے باغ میں ببول کے دو چار درخت اگ آنے سے وہ باغ ببولوں کا جھنڈ نہیں کہلائے گا۔اسی لیے تو شاعری کو ''تمام پیغمبری'' نہیں ''جزولیست از پیغمبری'' کہا گیا ہے۔

بعض حضرات اقبال سے ہمدردی جتاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اقبال کو شاعر اسلام ماننے سے اقبال کی آفاقیت پر حرف آتا ہے ۔اور اقبال ایک فرقہ کا شاعر بن کر رہ جاتا ہے۔ان ہمدردان اقبال میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو اسلام سے بیر ہے اور وہ ایسی باتیں کر کے اقبال کے پیغام کی اہمیت کو کم کرنا اور افکار اقبال کو بے وزن بنانا چاہتے ہیں۔ یہ اقبال کے ساتھ ہمدردی نہیں بلکہ اسلام کے ساتھ دشمنی ہے۔

دوسرا گروہ ان مسلمانوں کا ہے جو اسلام کو دوسرے مذہبوں کی طرح پوجا پاٹ کی چند رسموں سے عبارت سمجھتے ہیں۔اسلام کے بارے میں ان کا تصور انتہائی محدود ہے ۔ان کے دماغوں میں یہ بات نہیں سما سکتی کہ سیاست' حکومت' معیشت' تجارت' اور ادب اور زندگی کے بعض دوسرے شعبوں سے بھی اسلام کوئی سروکار نہیں رکھتا ہے۔یہی تنگ نظری اور خیال وفکر کی محدودیت ہے جسے اقبال نے ''ملائیت'' سے تعبیر کیا ہے۔ملا (۱) یہ سمجھتا ہے کہ مسجد کے اندر تو مسلمان نمازی ہوتا ہے اور مسجد سے نکلتے ہی بے نمازی ہو جاتا ہے۔اقبال کا یہ نظریہ ہے کہ جس

طرح مسجد میں مسلمان نماز کے ایک ایک رکن کو ادا کرتا ہے اسی مسجد کے باہر بھی مرد مومن کی زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت بسر ہونی چاہیے۔ مسلمان کی پوری زندگی عبادت ہے۔ اسلام مکمل ترین قابل عمل ضابطہ حیات ہے اور پوری زندگی کو محیط ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ کو اسلام کے دائرے سے مستثنیٰ اور منفک نہیں کیا جا سکتا۔

جو شاعرہ پیغام دیتا ہو:

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

وہ شاعر اسلام نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کیا کوئی آدمی بہ صحت ہوش و حواس ایسی بے تکی بات کہہ سکتا ہے کہ محمد ابن عبداللہ (ہماری جانیں حضورؐ پر قربان ہوں) پیغمبر اسلام ہونے کے سبب محدود نبوت کے حامل ہیں اور حضور کی رسالت آفاق گیر نہیں ہے۔ جب اسلام پیش کرنے سے پیغام محمد کی ہمہ گیری بلکہ جہاں گیری اور آفاقیت میں ذرہ برابر کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تو اقبال کی شاعری کو بھی اسلام کی ترجمانی نے محدود نہیں لامحدود، کائناتی اور آفاق گیر بنا دیا ہے۔

---

(۱) بعض مسٹروں (ماڈرن ملاؤں) کا بھی یہی حال ہے۔

''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' اسلام کا کلمہ ہے یا اشتراکیت کا نعرہ ہے؟ پورا

اسلام اسی کلمہ جامعہ کی تفصیل اور عملی تشریح ہے۔ اولین و آخرین کے امام سیدنا محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے یہ کلمہ جب بلند کیا تھا تو تمام باطل اور طاغوتی قوتیں حضور کی مخالف ہو گئی تھیں۔ سرمایہ داری، ملوکیت، قبیلوں کی چودھراہٹ، کہانت، بت پرستی، نسل و رنگ کا غرور، قوم پرستی، فسق و فجور غرضیکہ باطل جس بھیس میں بھی پایا جاتا ہے وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کلمہ کی زد براہ راست مجھ پر پڑ رہی ہے۔ کفر و شرک کے ایوانوں میں اس کلمہ نے زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

اس اسلامی غزل میں اقبال نے دینی انقلاب کی دعوت دی ہے اور ہر جھوٹے خدا سے بغاوت کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اقبال یہی چاہتے تھے کہ ملت اسلامیہ اس کلمہ کی عملاً مبلغ بن جائے تاکہ مسلمان دنیا کی سیاست و قیادت اور امامت کا پھر سے شرف حاصل کر سکیں۔

صنف نازک کے لیے علامہ اقبال نے حضرت سیدنا بتول فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی سیرت و کردار کو نمونہ اور معیار سمجھتے ہیں:

مزرع تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

اور

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

اس بے حجابی اور بے باکی کے دور میں علامہ اقبال مسلمان عورت کے سامنے کسی رادھا، ساوتری، زرینہ، نور جہاں، ایلزبتھ، وکٹوریہ، گریٹا گاربو کا کریکٹر نہیں حضرت فاطمہ بنت رسول کا مقدس و معصوم کردار پیش کرتے ہیں اور

''پنہاں شو ازیں عصر''

کی تلقین فرماتے ہیں کہ اے عورت مسلمہ! تو حضرت بتول فاطمہ بننے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے زمانے کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتا کہ تو شبیر جیسے حق پسندوں مجاہدوں اور مقدس نونہالوں سے اپنی گود کو آباد کر سکے:

ضمیر عصر حاضر بے حجاب است
کشادش در نمود رنگ و آب است

جہانتابی ز نور حق بیاموز
کہ او با صد تجلی در حجاب است

اقبال کہتے ہیں کہ عصر حاضر کی فطرت بے حجابی ہے اور رنگ و آب کی چمک

دمک اور زلف و رخسار کی نمائش و آرائش میں اس کا غنچہ خاطر کھلتا ہے۔ مگر اے پردہ نشیں حرم! تو نور حق سے جہانتابی سیکھ کہ وہ صدہا تجلیوں کے باوجود حجاب میں ہے۔ یہ آخری شعر تو نقاب و حجاب اور جلباب و خمار کی اہمیت و افادیت پر الہامی شعر ہے مولانا گرامی نے اقبال کے ایسے ہی ملہمانہ شعروں سے متاثر ہو کر فرمایا تھا:

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

امیر امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان کو اقبال نصیحت فرماتے ہیں:

تازی کن آئین صدیق و عمر
چوں صبا بر لالہ صحرا گزر

سروری در دین ما خدمت گری است
عدل فاروقی و فقر حیدری است

سوز صدیق و علی از حق طلب
ذرہ عشق نبی از حق طلب

علامہ اقبال نے ان چند شعروں میں اسلامی حکومت کا منشور پیش کیا ہے۔ یہ کہ مسلمان حکومتوں کا آئین فرمانروائی آئین صدیق و عمر سے ملتا جلتا ہونا چاہیے۔ صدیق و عمر کا آئین حکومت کتاب و سنت کا ترجمان تھا۔ یہ آئین برسوں عملاً برتا

گیا ہے اور عوام نے اس آئین کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھا تھا۔ حضرت صدیق وعمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں امن و امان اور اطمینان کو وہ دور دورہ تھا کہ عوام کو احتجاج کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ غریبوں میں قناعت اور خودداری پائی جاتی تھی اور امیروں میں انکسار، ضرورت مندوں کی امداد کرنے کا جذبہ نام و نمود اور شہرت سے بلند ہو کر سخاوت اور انفاق فی سبیل اللہ کا داعیہ! آئین صدیق وعمر دنیا کے لیے اللہ کی رحمت تھا۔ اسلام میں حاکمیت کا تصور رعب جمانے اور پانی آن بان دکھانے کے لیے نہیں بلکہ عوام کی خدمت کے لیے ہے۔ اسلامی حکومت کے سربراہ کا ایک بوڑھی عورت گریبان پکڑ کر اپنا حق طلب کر سکتی ہے اور ایک بدو سر منبر اسے ٹوک سکتا ہے۔ عدل فاروقی کی نگاہ میں امیر و غریب اور مسلم و کافر سب برابر تھے۔ مال و دولت یا نسب و حسب یا قرابت کے کسی امتیاز کے بغیر دادرسی ہوتی تھی۔ شام کے یہودیوں نے عدل فاروقی کو دیکھ کر کہا تھا کہ زمین و آسمان اسی عدل کے سہارے قائم ہیں۔

فقر حیدری دنیا کے حاکموں اور فرمانرواؤں کو آئینہ دکھاتا ہے کہ حکمران طبقہ کی سادگی بے نفسی اور للّٰہیت معاشرے کو پاکیزہ بناتی ہے۔ فقر حیدری اسلامی معیشت واقتصاد کا ایک روشن نمونہ پیش کرتا ہے۔ فقر حیدری سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مسرفانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی کی ضد ہے۔ حاکم ہوں یا محکوم مزدور ہوں یا کارخانہ دار، سب کے لیے فقر حیدری میں اچھا نمونہ موجود ہے۔

سوز صدیق و علی جس دل میں پیدا ہو جائے گا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور خشیت

سے لبریز ہوگا۔ اس میں عزیمت و جرات بھی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے حضور اخبات و فروتنی بھی!

ذرہ عشق نبی کی کمیت کو نہیں کیفیت کو دیکھیے کہ وہ کفر و باطل کے پہاڑوں کے لیے ایٹم بم ثابت ہوتا ہے۔ عشق نبی کے ایک ذرہ کے ارد گرد نظام شمسی گردش کرتا ہے۔ اس ذرہ عشق نبی کو آفتاب و ماہتاب کے سلام آتے ہیں۔

اقبال کا یہ مصرع:

تازہ کن آئین صدیق و عمر

امیر امان اللہ خاں ہی کے لیے نہیں ہر مسلمان حاکم و فرمازوا کے لیے پیام ہے۔ نصیحت ہے، مشورہ ہے اور حرف ہدایت ہے۔ صدیق و عمر (رضی اللہ عنہما) کا آئین اگر تازہ ہو جائے تو تاریخ اپنے کو دہرا سکتی ہے۔ اور امت مسلمہ کو دنیا کی امامت و قیادت کا پھر سے اعزاز و شرف حاصل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆